© rasailojaraid.com

ڈاکٹر نجیب جمال
ذی شان تبسم

اٹھارویں صدی عیسوی کی اُردو شاعری یا ثانوی تاریخ

میتھیو آرنلڈ (۱۸۲۲ء۔۱۸۸۸ء) نے تو شاعری کو محض ''تنقیدِ حیات''[۱] کہنے پر اکتفا کیا تھا جب کہ ان کے ہم عصر فرانسیسی نقاد تائین (۱۸۲۸ء۔۱۸۹۳ء) نے ادب کو اپنے عہد اور زمانے کے اصول و عوامل کا عکس قرار دیتے ہوئے اسے عمرانیات کے تابع ہی کر دیا۔[۲] اتنی سخت گیر متابعت اگرچہ اُردو شاعری کا مزاج نہیں رہی تاہم آغاز سے ہی سماجی عکس پذیری اس کی اہم ترین خصوصیت ضرور رہی ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اُردو زبان اور شاعری کا فروغ صوفیا کرام کی خانقاہوں سے منسوب کیا جاتا رہا ہے[۳] اور بعض قدیم ترین کتب میں تو اُردو زبان کی بنیاد کا مرکز بھی انھی خانقاہوں کو قرار دیا گیا ہے[۴] جو مخصوص عوامل کے پیشِ نظر رنگ و نسل اور زبان و مذہب کی تفریقات سے بالاتر عظیم روحانی اور سماجی اجتماع گاہیں بن چکی تھیں۔ اس حوالے سے جہاں معروف چشتی بزرگ بابا فرید گنج شکرؒ (۱۱۷۳ء۔۱۲۶۶ء) کی اُردو شاعری کے نمونے فراہم کیے جاتے ہیں، وہاں ان کے روحانی جانشین حضرت نظام الدّین اولیاؒ (م:۱۳۲۵ء) کے مریدِ خاص امیر خسرو (۱۲۵۳ء۔۱۳۲۵ء) کا نام خاص طور پر پیش کیا جاتا ہے، جنھوں نے نہ صرف اُردو زبان میں شاعری کی بل کہ ''خالقِ باری'' کے نام سے پہلی منظوم اُردو لغت بھی تصنیف کی۔[۵] امیر خسرو اپنے عہد کی متحرک ترین سماجی شخصیت تھے اور اپنے زمانے کے تمام بڑے تہذیبی اداروں، دربار، خانقاہ، موسیقی اور شاعری سے براہِ راست متعلق تھے۔ ان کی شخصیت کے حوالے سے یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ پہلے معروف مسلمان شاعر ہیں جو اپنے ہندی الاصل ہونے پر فخر کرتے ہیں۔[۶] ہندوستانی سرزمین سے امیر خسرو کی محبت 'وطن پرستی' کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ اُن کی فارسی اور اُردو شاعری کے منظر نامے میں ہندوستانی مظاہر کثرت سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ ''دول رانی خضر خاں'' اور ''نُہ سپہر'' امیر خسرو کی وہ فارسی مثنویاں ہیں جن میں خصوصیت سے ان کی حُبّ الوطنی ظاہر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتی ہے۔ اوّل الذکر مثنوی میں ہندوی زبان، ہندوستانی لباس، مقامی پھلوں، پھولوں اور ہرے بھرے سبزے کی ستائش کی گئی ہے۔ ''نُہ سپہر'' میں دلّی کی دوسرے شہروں پر برتری کا دعویٰ کیا ہے اور ڈاکٹر اسلم فرّخی کے لفظوں میں ''برصغیر کی آب و ہوا، نباتات، پرند و چرند، علوم، مذاہب اور زبان سب کو بڑی خوبی، جوش اور جذبے سے بیان کیا ہے اور اسے خراسان پر فضیلت دی گئی ہے۔'' ۷ امیر خسرو محض اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہندوستانی حسن کو ہی معیارِ حسن ٹھہراتے ہیں اور وطن پرستی کے جوش میں ہندوؤں کی علمی فضیلت کے حق میں کم و بیش دس دلیلیں بھی فراہم کرتے ہیں۔ ۸

امیر خسرو کی وطن پرستی کی ایک وجہ ان کی دربار سے وابستگی بھی رہی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں شعر گوئی کو صنعت کا درجہ حاصل رہا ہے اور اس صنعت کی تجارتی منڈی دربار اور درباری امرا ہی رہے ہیں، اسی وجہ سے فطری طور پر شعرا کا تاریخی اور سیاسی شعور پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور وہ عام لوگوں کے مقابلے میں ملکی صورتِ حال سے زیادہ باخبر بھی رہتے تھے، یوں اُردو شاعری ہندوستانی تاریخ کے سارے اُتار چڑھاؤ سے باخبر رہی اور اب اِس 'جامِ جہاں نما' میں صدیوں کی رنگارنگی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

سترھویں صدی عیسوی کے اختتام تک مخصوص سیاسی عوامل کی وجہ سے جنوبی ہند اُردو شاعری کا بڑا مرکز رہا۔ دریں اثناء اُردو زبان برابر صاف ہوتی اور نکھرتی چلی گئی اور ولی دکنی (م: ۲۵۔۱۷۲۰ء) تک آتے آتے یہ اپنی ترقی یافتہ شکل کو پہنچ گئی۔ جنوبی ہند میں ہی اُردو نثر کے بعض معیاری نمونے فراہم ہو گئے تھے اور بیش تر اصنافِ شعر کا مزاج بھی متعین ہو گیا تھا، خاص طور پر مثنوی، مرثیہ، نظم اور غزل کے صنفی معیارات بڑی حد تک واضح ہو چکے تھے۔ ولی دکنی نے اٹھارویں صدی کے ربع اوّل (۲۲۔۱۷۲۱ء) میں جنوبی ہند کی اِس عروسِ سخن کو سولہ سنگھار کے ساتھ شمالی ہند کی طرف رخصت کیا، دیکھتے ہی دیکھتے یہ اپنا میکہ بھول گئی اور سسرال سے ایسا جی لگایا کہ سب کے من کو بھا گئی۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ شمالی ہند میں اُردو شاعری کا باقاعدہ آغاز اُس وقت ہوا جب سلطنت نے زوال کا تازہ تازہ مزہ چکھنا شروع کر دیا تھا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے لفظوں میں:

> ''اِدھر دِلّی میں ایوانِ شعر و ادب کی بِنا رکھی گئی، اُدھر قصرِ حکومت کی بنیادیں ہلنے لگیں۔'' ۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یوں اُردو شاعری نے شمالی ہند میں تاریخ کے متوازی جس سفر کا آغاز کیا، اُس میں ہر مقام جائے عبرت اور ہر راستہ کانٹوں کا جنگل تھا، تاہم اُردو شاعری نے یہ سفر بڑی پامردی سے طے کیا، یہ اور بات کہ اِس کی آنکھیں تمام سفر میں لہو اُگلتی رہیں، گالوں پہ زردیاں کھنڈ گئیں، ہونٹوں کے گلاب مرجھا گئے، لہجہ گلوگیر رہا، قامت خمیدہ ہو گئی اور پاؤں خارِ مغیلاں سے چھلنی چھلنی ہو گئے، تاہم اس سفر کا حاصل یہ نکلا کہ اُردو شاعری کے آئینہ خانے میں اپنے زمانے کے تمام تر تہذیبی رنگ اور سیاسی و سماجی نشیب و فراز عکس پذیر ہو گئے۔ تغزل کی لے کو نبھاتے ہوئے بھی اُردو شاعری اپنے لہجے، لفظیات اور موضوعات کے اعتبار سے سطحِ زمین سے پیوست رہی۔ اگرچہ اِس کی تلمیحات، علامات اور کنایات میں بدیسی ادبی روایات کا غلبہ رہا، تاہم ان اشارات کے پسِ پردہ معنویت کی تمام سطحیں مقامی فضا اور سماجی مؤثرات کے تناظر میں ہی کھلتی ہیں۔ اُردو شعرا نے سرگزشتِ عشق کے پسِ پردہ جو داستانیں سنائیں اُس کے کردار اُس وقت کے معاشرے ہی میں سانسیں لے رہے تھے، آپ بیتی کے پردے میں جگ بیتی کا فن کارانہ اظہار معیارِ شاعری بن گیا تھا، ہر کان، گوش بر آواز اور ہر دل، محرمِ راز تھا۔ اجتماعی شعور شعری علامات کی آڑ میں کچھ اس طرح ظاہر ہو رہا تھا:

لٹی مے، اُٹھ گیا ساقی، مرا بھی پُر ہو پیمانہ
الٰہی! اس طرح دیکھوں میں کن آنکھوں سے مے خانہ

محتسب! آج تو مے خانے میں تیرے ہاتھوں
دل نہ تھا کوئی کہ شیشے کی طرح چُور نہ تھا

کب اختیار اپنا، جوں گل ہے اِس چمن میں
گل چیں سے کیا چلے ہے، کیا زور باغباں پر

اُردو شاعری نے شمالی ہند میں اپنا یہ سفر کن حالات میں طے کیا، اور کیسے کیسے تلخ و شیریں حوادث کا مزہ چکھا، یہ جاننے کے لیے اٹھارویں صدی عیسوی کے سیاسی و سماجی حالات اور تہذیبی فضا کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہیں ہو گا۔ یہ مطالعہ اِس لیے بھی ناگزیر ہے کہ اِسی منظرنامے نے اٹھارویں صدی کے شعری مزاج کا تعیّن کیا، جس کے تمام عناصر اپنے مخصوص حالات و واقعات کے مرہونِ منت تھے اور تصوّف کا خاص مزاج بھی انھی حالات کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اٹھارویں صدی عیسوی، جسے یورپ میں آغازِ جمہوریت، فکری اجتہادات، خرد افروزی، علمی ترقیات اور سائنسی اکتشافات کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے، بدقسمتی سے اسے مسلم مشرق اور بالخصوص برصغیر کے تناظر میں دیکھا جائے تو ''آہِ سرد'' ۱۲ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس صدی کا آغاز ہندوستان میں تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی منظر نامہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ظہیر الدّین بابر (۱۵۲۶ء۔۱۵۳۰ء) کی قائم کردہ عظیم مغلیہ سلطنت (۱۵۲۶ء۔۱۸۵۷ء) کا آفتابِ کمال، نصف النہار تک پہنچ کر بتدریج 'مغرب' کی طرف ڈھلتا چلا گیا اور یوں کہ پھر چشمِ فلک نے اسے کبھی اُبھرتا ہوا نہ دیکھا۔ اورنگ زیب عالم گیر (۱۶۵۹ء۔۱۷۰۷ء) جیسا بالغ نظر حکمران، اپنی غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں، تدّبر و فراست، جہدِ مسلسل اور راست عمل کے باوجود، اپنے بعد ایسے جانشین نہ چھوڑ سکا جن میں اپنے اسلاف ایسی جرأت و شجاعت، حوصلہ مندی اور اولوالعزمی نہ سہی، کاروبارِ سلطنت چلانے کی عمومی سوجھ بوجھ، مستقبل بینی اور ضروری فہم و فراست ہی ہوتی۔ ان جانشینوں کی ہوسِ اقتدار، باہمی ناچاقی، عیش پسندی، گروہ پروری اور ناطاقتی نے وہ گُل کھلائے کہ پھر اگلے ڈیڑھ سو سال تک سرزمینِ ہندوستان نے 'نخلِ ماتم' ۱۳ کے سوا کچھ نہ دیکھا۔ اورنگ زیب، نے اپنا بیش تر دورِ اقتدار ہندوستان کے تمام جغرافیائی خطّوں کو ایک وحدت میں منسلک کرنے کی کوششوں میں گزارا لیکن اس کی وفات (۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء) کے ساتھ ہی ''یہ خطّے ہار کے موتیوں کی طرح بکھر گئے۔'' ۱۴ اور اس کے بعد انگریزی سامراج کے باقاعدہ تسلّط تک لامرکزیت ہی ہندوستان کا مقدّر ٹھہری۔

اورنگ زیب نے تخت نشینی کی امکانی خانہ جنگی کے پیشِ نظر، مغل سلطنت کے بیس (۲۰) صوبوں کو بہ تدبیر اپنے تینوں بیٹوں میں تقسیم کر دیا تھا، تاہم مغل شہزادے اس تقسیم پر قانع نہ رہ سکے اور پہلا معرکہ بڑے بیٹے محمد معظم اور اعظم شاہ کے مابین ہوا ۱۵ جس میں اعظم شاہ، اپنے بیٹے شہزادہ بے دار بخت کے ساتھ مارا گیا۔ بعد میں تیسرا بیٹا کام بخش بھی حیدر آباد کے قریب 'قسمت آزمائی' ۱۶ کرتا ہوا مجروح ہوا، اور زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم دے گیا۔ یوں محمد معظم (پ: ۵ ستمبر ۱۶۴۳ء۔ م: ۱۷ فروری ۱۷۱۲ء)، مغلوں کا روایتی 'حقِ برادران' ادا کر کے، بہادر شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ ۱۷

بہادر شاہ اوّل، کا پانچ سالہ دورِ حکومت (۱۷۰۷ء۔۱۷ فروری ۱۷۱۲ء) تخت نشینی کی مذکورہ قتل و غارت گری اور پھر سکھوں، مرہٹوں اور راجپوتوں کی بغاوتوں کو نمٹانے میں گزرا۔ انتقال کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وقت بھی وہ لاہور میں باغی سکھوں کی سرکوبی میں مصروف تھا۔ ۱۸ بہادر شاہ، ذاتی کردار کے لحاظ سے بہرحال اپنے اخلاف سے بہتر تھا تاہم اورنگ زیب جیسے سخت گیر، سنت پر عمل پیرا حکمران کا جانشین ہونے کے باوجود وہ حیرت انگیز طور پر شیعیت سے متاثر تھا۔ ثناء الحق کے لفظوں میں:

> ''وہ شیعیت کے رنگ میں اس درجہ رنگا گیا تھا کہ جو رسمیں بیجاپور اور گول کنڈہ کے محلات میں نہیں دیکھی گئی تھیں وہ دہلی کے لال قلعے میں نہایت اہتمام سے ادا کی جانے لگیں۔'' ۱۹

بہادر شاہ، شیعہ عقائد سے اس حد تک متاثر تھا کہ اس نے خطبۂ جمعہ میں ''علی ولی اللہ، وصی رسول اللہ'' کے الفاظ شامل کرنے کا حکم صادر کر دیا جس پر اہلِ سنت والجماعت کی طرف سے ملک بھر میں شدید ردِّعمل ہوا، احمد آباد میں جب ایک خطیب نے حکمِ شاہی پر عمل کیا تو ہجوم نے زیرِ محراب ہی اسے قتل کر ڈالا۔ لاہور میں عوامی احتجاج باقاعدہ تصادم کی صورت اختیار کرنے لگا۔ حاجی یار محمد نے، جو علمائے لاہور میں ممتاز ترین تھے، خود کو بہادر شاہ کے سامنے شہادت کے لیے پیش کر دیا اور بالآخر شدید ردِّعمل سے گھبرا کر بادشاہ کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ شیخ محمد اکرم کے لفظوں میں:

> ''جب جمعہ کے روز بادشاہ نے دیکھا کہ لاہور کے بازاروں میں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہیں تو اس نے اپنا حکم منسوخ کر دیا اور سلطنت میں خطبہ کے لیے وہی طرز اختیار کی گئی جو عہدِ عالم گیری میں رائج تھی۔'' ۲۰

بہادر شاہ کی اِس شیعیت پسندی کی ایک وجہ ساداتِ بارہہ میں سے دو بھائیوں سیّد عبداللہ خاں اور سیّد حسین علی خاں جیسے جرنیلوں سے اُس کا متاثر ہونا بھی تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر بھی ان سیّد برادران کی جنگی خدمات کا معترف تھا تاہم اس نے ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو محسوس کرتے ہوئے انھیں انتظامی عہدوں سے الگ رکھا۔ بہادر شاہ اس مصلحت کو نہ بھانپ سکا اور اس نے سیّد عبداللہ خاں کو الہ آباد اور سیّد حسین علی خاں کو بہار کا صوبے دار بنا دیا اور انھی انتظامی عہدوں کی وجہ سے کچھ عرصے بعد سیّد برادران کو مرکز میں فیصلہ کن طاقت بننے کا موقع مل گیا، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ دوسری طرف بہادر شاہ کی امورِ ملکی سے عدم دل چسپی کی یہ صورت تھی کہ اس کا نام ہی ''شہہِ بے خبر'' پڑ گیا تھا۔ ۲۱ تاہم اس کے اخلاف میں اصلاحِ احوال کی بجائے یہ بے خبری بڑھتی ہی چلی گئی۔ اورنگ زیب کے اِس جانشینِ اوّل، کے آنکھیں موندتے ہی، اس کے چاروں بیٹے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حسبِ روایت تختِ دہلی پر بیٹھنے کے لیے باہم برسرِ پے کار ہوگئے۔ اس دفعہ قرعۂ فال جہاں دار شاہ پے کار (۱۲-۱۷۱۲ء) کے نام نکلا اور وہ اپنے تینوں بھائیوں عظیم الشان، رفیع الشان اور جہان شاہ کے لہو سے 'سرخ رُو' ہو کر تختِ طاؤس پر متمکن ہوا۔

جہاں دار شاہ، ایک عاشق مزاج اور عیش پسند حکمران ثابت ہوا۔ اس کے شب و روز میں کاروبارِ سلطنت سے زیادہ، لال کنور نامی طوائف کو دخل تھا جسے ''امتیاز محل'' کے لقب سے ممتاز کیا گیا۔ اپنی چہیتی محبوبہ کی دل جوئی کے لیے جہاں دار شاہ نے اس کے بھائی خوش حال خاں کو ہفت ہزاری منصب دے کر آگرہ کا صوبے دار بنا دیا، مزید برآں اس کے چچیرے بھائی نعمت خاں کلاونت کو ملتان کا صوبے دار مقرر کر دیا جس پر اس کے بااعتماد وزیر ذوالفقار الملک خاں نے بادشاہ کے سامنے شدید احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ: ''جب قوّال صوبے داری کا کام سنبھال لیں، تو ہم خانہ زاد بے کار بیٹھے کیا کریں، طنبورے اور ڈھول ہی بجایا کریں۔''۲۲

اکثر مورخین نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ لال کنور کی سفاکانہ خواہش کی تکمیل میں لوگوں سے بھری ایک کشتی دریا میں غرق کرا دی گئی کیوں کہ وہ ڈوبتے ہوئے انسانوں کا منظر دیکھنا چاہتی تھی۔۲۳ قائم چاند پوری (م: ۱۲۰۸ھ/۹۴-۱۷۹۳ء) نے اس واقعہ کی طرف اپنے ایک شہر آشوب میں واضح اشارہ کیا ہے جس میں جہاں دار شاہ کے پوتے شاہ عالم ثانی کی ہجو بیان ہوئی ہے:

دادا ترا جو لال کنور کا تھا مبتلا — کہتا تھا کشتیوں کے ڈبونے کو برملا
اس خانداں میں حمق کا جاری ہے سلسلہ — دوں دوش کس طرح سے میں تیرے تئیں بھلا
آخر گدھا پن ان کا، ترا عذر خواہ ہے۲۴

جہاں دار شاہ نے صرف گیارہ ماہ حکومت کی لیکن اس مختصر مدّت میں ہی اس نے سلطنتِ مغلیہ کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ ثناء الحق کے لفظوں میں ''اس کے آتے ہی ایسا محسوس ہونے لگا کہ شمشیر و سناں کا دور ختم ہو چکا ہے اور طاؤس و رباب کا زمانہ آ گیا ہے۔''۲۵ نتیجتاً مختصر ترین مدت میں ہی صورت یہ بنی کہ ''ملک حد سے زیادہ گرانی کا شکار ہوا......'' اور ''......لوگ فاقوں مرنے لگے۔''۲۶ جہاں دار شاہ کے دور میں اخلاقی گراوٹ، زر پرستی اور بے حیائی کی جو صورتِ حال تھی اس کا درست اندازہ جعفر زٹلّی کے قطعہ ''دستور العمل در اختلافِ زمانۂ ناہنجار'' سے لگایا جا سکتا ہے جس کی ردیف ہی ''عجب یہ دور آیا ہے......'' ہے۔۲۷

جہاں دار شاہ، کو قدرت نے عیش و نشاط کے لیے زیادہ وقت نہیں دیا اور اسے اپنے بھتیجے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرخ سیر (م:۱۷۱۹ء) اور سیّد برادران (سیّد حسین علی، سیّد عبداللہ) کی مقابلتاً طاقت ور فوج کے ہاتھوں آگرہ کی ہلاکت خیز جنگ (جنوری ۱۷۱۳ء) میں عبرت ناک شکست ہوئی۔ وہ خود لال کنور کے ساتھ فرار ہوتا ہوا گرفتار ہوا اور بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔

فرخ سیر کے دورِ حکومت (۱۷۱۳ء۔۱۷۱۹ء) میں تختِ دہلی ایرانی اور تورانی (شیعہ، سنی) اختلافات کا اکھاڑا بن گیا اور انھیں اختلافات نے آگے چل کر صحیح معنوں میں مغلوں کی فوجی طاقت کو منقسم کر کے تباہ کر دیا۔ فرخ سیر کے پورے دور میں سیّد برادران (ایرانی گروہ) نے خوب کھل کر کھیلا جب کہ بادشاہ کی حیثیت، شاہِ شطرنج سے زیادہ نہ رہی۔ فرخ سیر نے سیّد عبداللہ کو وزیر سلطنت اور سیّد حسین علی کو دکن کا با اختیار صوبے دار بنا دیا تھا، تاہم فرخ سیر کے حوالے سے سیّد برادران کی بدگمانیاں بوجوہ بڑھتی چلی گئیں۔ سیّد حسین علی نے اپنی فوجی طاقت بڑھانے کے لیے دکن میں مرہٹہ نوازی کی حد کر دی اور انھیں بادشاہ سے 'چوتھ' اور 'سر دیش مکھی' کے اختیارات دلوانے کے وعدے پر اپنے ساتھ ملا لیا۔[۲۸] مولانا ابوظفر ندوی کے مطابق:

> "امیر الامرا سیّد حسین نے دس لاکھ سالانہ اور ضرورت کے وقت پندرہ ہزار سپاہی مہیا کرنے کے بدلے میں دکن کے پرانے رواج کے مطابق سرکاری محاصل کا چوتھ (یعنی کل محاصل کا چوتھا حصہ کمیشن کے طور پر) مرہٹوں کو دینا قبول کیا۔"[۲۹]

اس تناظر میں ابوالخیر کشفی کا یہ تجزیہ درست ہے کہ "سیّد حسین نے مرہٹوں کو اتنی مراعات دیں کہ وہ اس بحرانی دور کی فیصلہ کن طاقت بن گئے۔"[۳۰]

۱۷۱۹ء میں سیّد حسین علی، اپنے بھائی سیّد عبداللہ سے سانٹھ گانٹھ کر کے اپنے لشکر اور مرہٹوں کی اتحادی فوج کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا اور فرخ سیر کو اندھا کرا کے بے دردی سے قتل کر دیا۔ مرزا عبدالقادر بیدل (م:۱۷۲۰ء) نے اِس الم ناک واقعے کی تاریخ اس مصرعے سے نکالی:

> سادات بوئے نمک حرامی کردند
>
> (۱۱۳۱ھ) [۳۱]

فرخ سیر کی شخصیت میں بعض خوبیاں ضرور تھیں تاہم "اس میں جوانی کا جوش اور قوتِ فیصلہ کی کمی تھی۔"[۳۲] اس لیے وہ سیّد برادران کے چنگل میں پھنستا چلا گیا۔ بادشاہ کی متلون مزاجی،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امرا کی باہمی چپقلشوں، فرقہ ورانہ اختلافات اور پست اندازِ فکر نے ملکی صورتِ حال پر منفی اثرات مرتب کیے۔ بد انتظامی بڑھتی چلی گئی اور معاشی صورتِ حال مزید بگڑنے لگی۔ جعفر زٹلی نے اس صورتِ حال کے حوالے سے اپنا مشہور طنزیہ شعر کہا جس کی پاداش میں اسے فرخ سیر کے انتقام کی بھینٹ چڑھنا پڑا۔ شعر یہ ہے:

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر   بادشاہِ دانہ کش فرخ سیر

فرخ سیر کے دور کا غالباً سب سے اہم واقعہ انگریزوں کو تجارتی حقوق کی فراہمی ہے۔ اس کا سہرا ڈاکٹر ولیم ہملٹن کے سر جاتا ہے جس نے بیمار بادشاہ کا کامیاب علاج کیا اور اس کے بدلے انگریزوں کے لیے بہت سی مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے مطابق یہی مراعات ''کمپنی بہادر کے اقتدار کے عمل کی بنیاد بن گئیں۔''۳۴ ان میں سب سے اہم رعایت یہ تھی کہ کمپنی کے سکّے کو ساری مغل سلطنت میں چلانے کی اجازت بھی دے دی گئی۔۳۵

فرخ سیر کے قتل کے بعد، سیّد برادران نے اگلے چھے ماہ (۲۸ فروری تا ۲۴ اگست ۱۷۱۹ء) میں یکے بعد دیگرے رفیع الدرجات، رفیع الدّولہ بہادر شاہ ثانی اور نیکو سیر پسر سلطان اکبر بن عالم گیر نامی تین علامتی اور کمزور بادشاہوں کو تختِ دہلی پر بٹھایا۔ ان دو روزہ بادشاہوں کے بعد سیّد برادران کی نگاہِ انتخاب روشن اختر پر مہربان ہوئی اور محض اٹھارہ سال کی عمر میں وہ محمد شاہ کے لقب سے تختِ شاہی پر بٹھایا گیا (۱۸ ستمبر ۱۷۱۹ء)۔

محمد شاہ، ایک سہل پسند، کم جو اور امورِ ملکی سے غافل حکمران ثابت ہوا۔ اس کی عیش و نشاط سے بھرپور زندگی، اعتدال سے بڑھی حسن پرستی، نغمہ و سرود سے غیر معمولی دل چسپی اور کمال درجہ رغبتِ مسکرات، ضرب المثل بن چکی ہے اور انھی سرمستیوں اور 'زیرِ کمر سرگرمیوں' کی وجہ سے تاریخ نے اسے 'رنگیلا' کے بدنام زمانہ لقب سے نوازا ہے۔

محمد شاہ نے اگرچہ بڑی حکمت سے تورانی امرا کی مدد سے سیّد برادران سے پیچھا چھڑا لیا اور بوجوہ طبعی عمر تک تختِ شاہی پر متمکّن بھی رہا، تاہم اس کے تیس سالہ دورِ اقتدار میں ''حکومتِ دہلی کا وقار و اقتدار بتدریج کم ہوتا چلا گیا۔''۳۶ اور صورت یہ بنی کہ ''ایوانِ سلطنت کے ستون ایک ایک کر کے گرتے رہے۔''۳۷ اور وہ اس زوال کو محض تماشائی بنا ''غرقِ مئے ناب'' کرتا رہا۔''۳۸ دربار میں ایرانی، تورانی امرا کے مابین آویزش نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ منصبِ وزارت کے حصول کے لیے برابر رسّہ کشی ہوتی رہی۔ آصف جاہ نظام الملک، نے حالات کی بہتری کے لیے مخلصانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوششیں کیں، تاہم سیّد ہاشمی فرید آبادی کے مطابق جب نظام الملک نے ''دربارِ شاہی کو قدیم آئین پر مہذب و مرتب کرنے کی کوشش کی تو لااُبالی بادشاہ کو اس کی ثقاہت سے چڑ ہونے لگی۔''۳۹ محمد شاہ رنگیلا کی حد درجہ عدم توجہی اور بے اعتنائی ایک تو مزاجاً تھی، دوسرے اس کے گرد و پیش میں ادھم بائی ۴۰ اور رحیم النساء کوکی ۴۱ جیسی تیز طرّار خواتین اور قمر الدّین خاں (م:۱۷۴۸ء)، اعظم خاں اور مرزا متو ۴۲ جیسے موقع پرست اور عیش ونشاط کے دل دادہ امرا موجود تھے اور بادشاہ کے مزاج اور فیصلوں میں ان کا دخل بہت زیادہ تھا، لہٰذا اصلاحِ احوال میں ناکامی اور بادشاہ کی غیر سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے نظام الملک نے ۱۷۲۴ء میں منصبِ وزارت سے مستعفی ہو کر دکن کی راہ لی، جہاں اس نے آصف جاہی حکومت کی داغ بیل ڈالی جس نے ''آگے چل کر ایک محکوم اسلامی مملکت کی شکل اختیار کر لی اور وہ تقریباً دو سو سال تک اردو ادب اور شاعری کی خدمت کرتی رہی۔''۴۳

محمد شاہ، کی رنگین مزاجی کا منطقی نتیجہ، نادر شاہ (م:۱۷۴۷ء) کے حملے (۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۹ء) کی صورت میں نکلا، جس نے مغل سلطنت کے کھوکھلے پن کی قلعی پوری طرح کھول کر رکھ دی اور اس کے بعد مغل حکمرانوں کو اپنا رہا سہا بھرم قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ اس حملے میں جہاں ہزاروں لوگ لقمۂ اجل بنے، وہاں تمام تر شاہی خزانہ مع تختِ طاؤس کے لوٹ لیا گیا۔ نادر شاہی فوج نے گھروں میں گھس کر جو لوٹ مار کی وہ بھی کروڑوں میں بتائی جاتی ہے، ہاتھی، گھوڑے، نوادراتِ شاہی اور دوسرے قیمتی سامان کا تو حساب ہی نہیں۔ جے ایس گریوال کے مطابق:

> ''صوبہ ٹھٹھہ اور دریائے سندھ کے پار مغرب میں تمام مغل علاقے ایرانی بادشاہ کے نام کر دیے گئے۔ صوبہ لاہور کے چار پرگنے (چہار محل) سیالکوٹ، پسرور، اورنگ آباد اور گجرات بھی نادر شاہ کے حوالے کر دیے گئے۔''۴۴

اس تناظر میں الف۔ د۔ نسیم کا تجزیہ درست معلوم ہوتا ہے کہ: ''نادر شاہ نے سلطنتِ دہلی کے جسم سے سارا گوشت نوچ لیا اور اب وہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئی۔''۴۵

شکستوں سے چُور ہڈیوں کے اس ڈھانچے سے کس نے مرعوب ہونا تھا، یوں نادر شاہی حملے کے بعد مرکز کی کمزوری کھل کر سامنے آ گئی اور تیزی سے ہندوستان بھر میں نیم خود مختار ریاستیں قائم ہونے لگیں، اگرچہ صوبے دار اب بھی تختِ دہلی سے اطاعت کا دم بھرتے تھے، تاہم عملاً صورتِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حال یہ تھی کہ مغل حکمرانوں کا دورِ اقتدار دو آبہ گنگ و جمن کے صرف ایک حصّہ تک محدود ہوگیا تھا۔۶۴؎ سودا نے اپنے شہر آشوب ''مخمس در ویرانیِ شاہ جہاں آباد'' کے اس بند میں اسی ناطاقتی اور تحدیدِ اختیارات کی طرف اشارہ کیا ہے:

سپاہی رکھتے تھے، نوکر امیر، دولت مند   سو آمدان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدّت سے سرکشوں نے پسند   جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اُس کے تصرف میں فوج داریٔ کول ۶۷؎

ادبی حوالے سے محمد شاہ کے دور کا اہم ترین واقعہ ''دیوانِ ولی'' کا دہلی پہنچنا ہے۔ (۲۲۔۱۷۲۱ء)، اگرچہ اس سے پہلے ہی شمالی ہند میں اُردو شاعری کے نمونے فراہم ہونے لگے تھے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مطابق:

> ''دیوانِ ولی کی آمد سے پہلے کئی ریختہ گو شعرا کے نام مل جاتے ہیں۔ اس فہرست میں مرزا معز الدّین موسوی، بیدل، قبول کشمیری، سعد اللہ گلشن، قزلباش خاں امید، نواب امیر خاں انجام، آرزو اور مخلص وغیرہ شامل ہیں۔'' ۶۸؎

تاہم ''دیوانِ ولی'' کی آمد نے دِلّی کی شعری فضا کو یک سر بدل دیا اور اب فارسی مشاعروں کی جگہ مراختوں نے لے لی۔ متقدمین اردو شعرا کا دورِ اوّل، عہدِ محمد شاہی سے ہی شروع ہوتا ہے۔ ایہام گوئی یا ذومعنویت، اس عہد کی شاعری کا اہم ادبی رجحان ہے۔ لفظی چٹکلے، صنعت گری، معانی کی تلاش اور ذہنی موشگافیوں، جیسی خصوصیات معیارِ شاعری قرار پائیں۔ محمد شاہ کی دِلّی جہاں عملاً فعالیت کا گزر نہیں تھا اور متضاد عناصر ہر شعبۂ زندگی میں سرایت کیے ہوئے تھے، وہاں ذو معنویت ہی عمومی رجحان ہو سکتا تھا۔

ایہام گوئی کے بعد شمالی ہند میں سادہ گوئی کا رجحان دیکھنے کو ملتا ہے جس میں غزل اور مثنوی کے علاوہ جس صنفِ سخن کو غیر معمولی پذیرائی ملی، وہ شہر آشوب ہے۔ شمالی ہند کا پہلا شہر آشوب فرخ سیر کے دورِ حکومت میں جعفر زٹلی نے لکھا۔ اس نے دو شہر آشوبیہ نظمیں تخلیق کیں۔ ۶۹؎ محمد شاہی دور میں بالخصوص نادر شاہی حملے کے بعد شیخ ظہور الدّین حاتم، شاکر ناجی، درگاہ قلی خاں اور سودا کے شہر آشوب تخلیق ہوئے، جن میں سلطنت کی تباہ حالی، بادشاہ کی نااہلی، فوجی نظام کی مکمل تباہی، اہلِ علم و ہنر کی خواری، صنعت و حرفت کی تباہی اور نوکریوں کے فقدان، جیسے مسائل کھل کر پیش کیے گئے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یوں اُردو شاعری میں حقیقت پسندی، وضاحت نگاری، طرزِ ادا کی قطعیت اور عمومی فضا کی پیش کش جیسی خصوصیات رائج ہوئیں۔ ان شہر آشوبوں کو دیکھ کر کون اُردو شاعری کے سماجی منصب پر حرف گیری کر سکتا ہے۔

محمد شاہ کی وفات (۲۶ اپریل ۱۷۴۸ء) سے چند ماہ پہلے احمد شاہ ابدالی نے لاہور پر حملہ کیا (۱۱ جنوری ۱۷۴۸ء)۔ محمد شاہ نے شہزادہ احمد شاہ، نواب قمر الدّین خاں اور ایشر سنگھ کی نگرانی میں دو لاکھ فوجیوں کا لشکر روانہ کیا۔ ۱۱ مارچ، کی فیصلہ کن لڑائی میں احمد شاہ ابدالی کو شکست ہوئی، تاہم اس لڑائی میں وزیرِ مملکت قمر الدّین خاں کام آیا، یہ کامیابی مغل حکمرانوں کی آخری بڑی فتح ثابت ہوئی۔ اِس واقعے کے صرف ڈیڑھ ماہ بعد محمد شاہ کا انتقال ہوا اور احمد شاہ (۱۷۴۸ء۔۱۷۵۴ء) باپ کی جگہ تخت نشین ہوا۔ اس کے چھے سالہ دورِ حکومت میں مغل تصرّفات میں مزید کمی واقع ہوئی اور ''سلطنت کے شمالی حصے یعنی پنجاب اور ملتان ابدالی کے تصرّف میں چلے گئے۔''۵۰ مرکز میں وزرا کے درمیان آویزش میں بھی اضافہ ہوا۔ احمد شاہ کی ماں ادھم بائی کی محلاتی سازشوں اور بادشاہ کے منہ چڑھے خواجہ سرا جاوید خاں کے غیر معمولی اختیارات ۵۱ کے خلاف امرا میں پائی جانے والی نفرت شدت اختیار کرتی چلی گئی، آخر صفدر جنگ کے ہاتھوں جاوید خاں خواجہ سرا مارا گیا (۲۷ اگست ۱۷۵۲ء) اور اِس واقعہ کے بعد ہی عماد الملک نے مرہٹوں کی معاونت سے احمد شاہ اور ادھم بائی کو اندھا کروا کے قیدِ زنداں میں ڈلوا دیا۔ احمد شاہ کا مکحول ہونا اور قید میں ڈالا جانا، ایسا واقعہ تھا جس نے ہر خاص و عام کو متاثر کیا۔ دہلی کے شرفاء اور امن پسند لوگ سراسیمہ ہو کر، محفوظ ریاستوں کا رُخ کرنے لگے۔ شعرا کی ہجرتوں کا عمل بھی عروج کو پہنچ گیا۔ سوزؔ (م:۹۹۔۱۷۹۸ء) پہلے ہی نامساعد حالات کے پیشِ نظر دِلّی چھوڑ چکے تھے، اب خان آرزوؔ اور اشرف علی فغاںؔ نے بھی مشرق کی راہ لی، اور سوداؔ بھی کچھ عرصہ بعد فرخ آباد چلے گئے۔۵۲ میرؔ کے بہنوئی، میر محمد حسین کلیم، نے اس سانحہ کا ذکر اس انداز میں کیا:

''کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر — آج کے دن ہو بیٹھے ہیں اندھے ہو
بصیر ایسی دولت سے زینہار — فاعتبروا یا اولی الابصار''

خود میرؔ کا یہ مشہور شعر اس سانحۂ عظیم کی یادگار ہے:

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی — انھی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں ۵۴

احمد شاہ، کے بعد شہزادہ عزیز الدّین (م:۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء)، 'عالمگیر ثانی' کے لقب سے تخت پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بٹھایا گیا (۴مئی ۱۷۵۴ء)۔ اس کی بادشاہت عماد الملک کے مرہونِ احسان رہی۔ عالم گیر ثانی کے تقریباً چھے سالہ دورِ حکومت میں دو اہم واقعات ہوئے:

i- احمد شاہ ابدالی، جسے ۱۷۴۸ء کے معرکۂ لاہور میں شکست ہوئی تھی، وہ جنوری ۱۷۵۷ء میں لاہور کو فتح کرتا ہوا دہلی تک پہنچ گیا اور یہاں اس کی فوج نے غارت گری اور لوٹ مار کی وہ الم ناک داستان رقم کی کہ اس کے بعد دِلّی کی مانگ ہمیشہ سندور سے خالی رہی۔ احمد شاہ ابدالی، نے اپنے پیش رونادر شاہ کی طرح محض دہلی کے مال و دولت پر اکتفا نہ کیا بل کہ جنوب کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے بلبھ گڑھ کا قلعہ بھی فتح کرلیا (۳ مارچ ۱۷۵۷ء)، یہاں ابدالی لشکر نے اخلاقیات کا جنازہ ہی نکال ڈالا۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے مطابق: ''جن مغویہ عورتوں سے ابدالی کے سپاہی زنا کرتے تھے، ان کی فریاد و فغاں سے راتوں کو کان پڑی آوازیں سنائی نہ دیتی تھیں۔'' ۵۵

بلبھ گڑھ کے بعد متھرا اور آگرہ کو بھی تباہ و برباد کر دیا گیا اور صرف آگرہ میں ''بیس ہزار سے زائد انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔'' ۵۶ دریں اثنا لشکر میں ہیضے کی وبا پھوٹنے کی وجہ سے جب ابدالی نے واپسی کا قصد کیا تو باوجود کہولت کے محمد شاہ کی صاحب زادی حضرت بیگم، کو زبردستی منکوحہ بنا لیا۔ افغانستان واپسی کے وقت ابدالی، ہندوستان کے عزت و وقار کے ساتھ ساتھ جو مال و اسباب لوٹ کرلے گیا، اُس کی تفصیل ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے لفظوں میں ملاحظہ کیجیے:

> ''ابدالی کا قافلہ قندھار کی طرف چلا تو مالِ غنیمت ۲۸ ہزار اونٹوں، ہاتھیوں، خچروں اور بیل گاڑیوں پر لدا ہوا تھا۔ ساری فوج پیدل چل رہی تھی کیوں کہ اُن کی سواریوں پر مال و اسباب تھا۔ دِلّی میں جانور عنقا کا حکم رکھتے تھے کیوں کہ ابدالی نے چلتے وقت دِلّی میں مریل گدھا بھی نہیں چھوڑا تھا۔'' ۵۷

ii- عالم گیر ثانی کے دورِ حکومت کا دوسرا اہم واقعہ جس نے ہندوستان میں سیاسی مستقبل کا نو آبادیاتی چہرہ مصوّر کیا، جنگِ پلاسی (۱۷۵۷ء) میں انگریزوں کے ہاتھوں بنگال کے صوبہ دار نواب سراج الدّولہ (م: ۱۷۵۷ء) کی شکست ہے۔ اس جنگ میں کام یابی کے بعد جہاں شمالی ہندوستان میں انگریزوں کے قدم مضبوط ہوئے، وہاں میر جعفر جیسے ملّت فروش جاہ پسند امرا اور آستین کے سانپوں کا زہریلا چہرہ بھی بے نقاب ہوگیا اور یہی خشتِ باغیان تھے جنھیں آگے چل کر انگریزی اقتدار کے بدہیئت قلعے میں نصب ہونا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جنگِ پلاسی میں شکست اور احمد شاہ ابدالی کی غارت گری نے دِلّی کی تہذیبی بساط کے ہر مہرے کو ہلا کر رکھ دیا، معیشت جو پہلے ہی تباہ تھی اب تباہ کن ہوگئی، اخلاقی صورتِ حال بھی بدتر ہوگئی اور زندگی کی مثبت قدروں پر سے اعتماد اُٹھنے لگا۔ یہی وہ منظر نامہ ہے جس میں اُردو شاعری کا زرّیں دور پروان چڑھا اور اردو شاعری نے اسی کشتِ خوں سے سرخ آنسوؤں کی مے کشید کی جس کا ہر ہر قطرہ آج دِلّی کی خونی داستان کے لیے سرخ روشنائی کا کام دیتا ہے۔ یہی صورتِ حال تھی جس نے میرؔ کے 'دلِ پُر خوں' سے ایسے زندگی گریز مصرعے کہلوائے:

ایسی صحبت میں ہم نہ ہوتے کاش ۵۸

''ذکرِ میر'' میں میرؔ نے عمومی تباہ حالی اور ذاتی افلاس کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچا ہے:

''میں کہ (پہلے ہی) فقیر تھا اب اور زیادہ مفلس ہوگیا۔ افلاس اور تہی دستی سے میرا حال بہت ابتر ہوگیا۔ سڑک کے کنارے جو میرا تکیہ (مکان) تھا، وہ بھی ڈھے کر برابر ہوگیا۔ غرض کہ وہ بے مروّت سارے شہر کو لاد کر لے گئے اور شہر کے لوگ ذلت (ورسوائی) اٹھا کر جان سے گزر گئے۔'' ۵۹

خواجہ میر درد، جیسے حوصلہ مند بزرگ گلزارِ دہلی کے خزاں کے ہاتھوں تاراج ہونے پر ۶۰ پھوٹ پھوٹ کر روئے اور زندگی جیسے ساحل کو طوفان سے تشبیہ دینے پر مجبور ہوتے ہوئے لحہ لحہ مرنے کے تجربے کرنے لگے:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

سوداؔ اور نظیرؔ اکبر آبادی کے شہر آشوب اس عہد کے روحانی کرب، معاشی بدحالی، اخلاقی تباہ حالی اور انتشار و بے چینی کے صحیح ترجمان ہیں۔ سودا کا یہ شعری تبصرہ فقدانِ آسودگی کا عمدہ بیانیہ ہے:

دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے

اس دور میں پیری فقیری کو بڑھاوا ملا اور بے پیر اور بے استاد ہونا گالی بن گیا، خود بادشاہ عالم گیر ثانی حد درجہ پیر پرست واقع ہوا تھا اور یہی پیر پرستی اس کی اندوہناک موت کا سبب بھی بنی، عماد الملک نے ''اسے ایک خدا رسیدہ بزرگ سے ملانے کے بہانے فیروز شاہ کو کوٹلہ میں بلایا اور قتل کرا کر برہنہ لاش کو جمنا کی ریتی پر پھنکوا دیا۔'' ۶۳

عالم گیر ثانی، کے قتل کے وقت اس کا بیٹا عالی گہر بنگال میں درپیش بغاوتوں کو کچلنے کے لیے عظیم آباد کی طرف جا رہا تھا، اس نے باپ کے سانحۂ ارتحال کی خبر سن کر کھٹولی کے مقام پر ''شاہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عالم ثانی'' کا لقب اختیار کر کے بادشاہت کا اعلان کیا (۲۳ ستمبر ۱۷۵۹ء) تاہم عماد الملک نے مرکز میں اس کے نوعمر بیٹے کو شاہ جہاں ثانی (۳۰ نومبر ۱۷۵۹ء۔ ۱۰ اکتوبر ۱۷۶۰ء) کے لقب سے تخت نشین کر دیا۔ یوں بیک وقت تختِ دہلی کے دو دعوے دار سامنے آ گئے، تاہم یہ دونوں عملاً بے بس اور حالات و واقعات کے رحم و کرم پر تھے۔ دوسری طرف مرہٹے، سکھ اور جاٹ تینوں مغل حکومت کی تباہی کی مشترکہ مہم پر کمر بستہ تھے، آگرہ اور بھرت پور کے علاقوں میں جاٹ، جنوبی خطے میں مرہٹے اور پنجاب میں سکھ یورشیں عروج پر تھیں۔ خاص طور پر مرہٹے جو ذکاء اللہ دہلوی کے لفظوں میں ''آدھے بادشاہ، اور آدھے راہ زن تھے۔''۶۴ دتا سندھیا کی قیادت میں بہت مضبوط ہو چکے تھے اور پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ اس صورتِ حال میں حضرت شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے اور مسلم حکومت کو بچانے کی دعوت دی جس کے نتیجے میں ۱۳ جنوری ۱۷۶۱ء کو پانی پت کی تیسری جنگ شروع ہوئی جس میں احمد شاہ ابدالی نے نواب نجیب الدّولہ اور نواب شجاع الدّولہ کے ساتھ مل کر مرہٹہ فوج کو فیصلہ کن شکست دی اور یوں مرہٹوں کا پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب محض 'تلخ یاد' بن کر رہ گیا۔ احمد شاہ ابدالی کی فوجیں محض دو ہفتے کے مختصر وقت میں دِلّی شہر میں بارِ دگر داخل ہو گئیں، اور باوجود اس کے کہ حضرت شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء۔۱۷۶۳ء) نے اسے خدا اور رسولؐ کا واسطہ دے کر مسلمانوں کے مال اور عزت لوٹنے سے منع کیا تھا، وہ باز نہ آیا۔ ابدالی فوج نے اس قدر غارت گری اور ڈاکہ زنی کی کہ اس کی سابقہ لوٹ مار بھی اس کے سامنے شرمندہ ہو گئی۔ دِلّی شہر ایک نئے ویرانے میں بدل گیا اور ہر جا، جاے عبرت میں تبدیل ہو گئی۔ میر تقی میر جو اس سانحے کے عینی شاہد ہیں ''ذکرِ میر'' میں اس بربادی کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچتے ہیں:

> ''ایک دن میں ٹہلنے نکلا اور شہر کے تازہ ویرانوں سے گزرا۔ ہر قدم پر روتا اور عبرت حاصل کرتا تھا۔ جوں جوں آگے بڑھا حیرت بڑھتی گئی۔ مکانوں کو شناخت نہ کر سکا، کسی گھر کا پتا تھا نہ کسی عمارت کے آثار۔ نہ اُن کے مکینوں کی خبر...... گھر کے گھر مسمار تھے اور دیواریں شکستہ۔ خانقاہیں صوفیوں سے خالی، خرابات رندوں سے، یہاں سے وہاں تک ایک ویرانہ تھا لق ودق...... نہ وہ بازار (تھے) جن کا بیان کروں، نہ بازار کے وہ حسین لڑکے...... جوانانِ رعنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گزر گئے، پیرانِ پارسا چلے گئے، (بڑے بڑے عالی شان) محل خراب (ہو گئے) گلیاں معدوم ہو گئیں اور ہر طرف وحشت برس رہی تھی۔''٦٥

میرؔ نے مذکورہ چشم دید احوال کو، تخلیقی سطح پر اشعار کی صورت میں بھی بیان کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جس جا کہ خس و خاک کے اب ڈھیر لگے ہیں   یاں ہم نے انھی آنکھوں سے دیکھی ہیں بہاریں
اب شہر ہر طرف سے میدان ہو گیا ہے   پھیلا تھا اس طرح سے کاہے کو یاں خرابہ
زیرِ فلک بھلا تو رووے ہے آپ کو میر   کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہے
اب خرابہ ہوا جہاں آباد   ورنہ ہر اِک قدم پہ یاں گھر تھا

میر کی شاعری میں 'خرابہ'، 'خاک'، 'ویرانہ'، 'دھواں'، 'چٹیل میدان'، 'بے روغن چراغ' وغیرہ جیسے تلازمے اسی زمینی شکستگی کے بلیغ اظہاریے ہیں۔ میر درد کی زبانی زمانے کی ستم گری اور انسان دشمنی کا احوال بھی ملاحظہ کرتے چلیے:

گزرو ہوں جس خرابے سے کہتے ہیں واں کے لوگ
ہے کوئی دن کی بات، یہ گھر تھا، یہ باغ تھا

اہلِ زمانہ آگے بھی تھے اور زمانہ تھا
پر اب جو کچھ ہے یہ تو کسو نے نہ سنا تھا

زمانے کی نہ دیکھی جرعہ ریزی درد کچھ تو نے
ملایا مثلِ مینا خاک میں خوں ہر شرابی کا

احمد شاہ ابدالی، مارچ ۱۷۶۱ء میں تباہی و بربادی کی رنگین کہانی رقم کر کے افغانستان لوٹ گیا، تاہم جاتے جاتے اس نے شاہ عالم ثانی کی اصولی بادشاہت تسلیم کر لی۔ شاہ عالم کا دورِ حکومت ہر لحاظ سے سلطنتِ مغلیہ کے مکمل زوال پر منتج ہوا، بالخصوص ۱۵ ستمبر ۱۷۶۴ء کی ''جنگِ بکسر'' میں انگریزوں کے ہاتھوں شکست کے بعد، بادشاہ کی حیثیت محض کٹھ پتلی کی سی رہ گئی جسے انگریز اور مرہٹے٦٨ حسبِ منشا نچاتے رہے، بادشاہ کی بے بسی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے، کہ اعلانِ بادشاہت کے باوجود وہ دس سال تک تختِ دہلی سے دور بھٹکتا رہا اور بالآخر اسے مرہٹوں کی اعانت سے دسمبر ۱۷۷۲ء میں خاکِ وطن تک رسائی ہوئی۔ دہلی آ کر بھی شاہ عالم نے سکون کے چار دن نہ کاٹے، مرہٹہ سرداروں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے دباؤ پر اسے روہیلوں کے خلاف اعصاب شکن جنگ کرنا پڑی اور مسلم افواج کے خلاف لشکر کشی کی وجہ سے اُسے عام مسلمانوں میں رسوائی کا سامنا بھی رہا۔ خواجہ منظور حسین نے شاہ عالم ثانی کی بے طاقتی، حد درجہ مجبوری، اقتدار پسندی اور رعایا میں بے قدری کا تجزیہ اِن لفظوں میں کیا ہے:

''اُس نے کبھی انگریزوں سے، کبھی مرہٹوں سے جوڑ توڑ کر کے، ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کے، اپنی جان تو بچائے رکھی، اپنی رعایا کے سلگتے ہوئے جذبات کا ذرا پاس نہ کیا...... شاہ عالم کے عہد کی شاعری میں اس کی ناگفتہ بہ درگت نہ صرف در پردہ، بلکہ کھلم کھلا بھی پائی گئی ہے۔ قائم اور مصحفی اس بے نقط، بے اماں سرزنش میں پیش پیش ہیں۔''۶۹

قیام الدّین قائم نے تو مجبور بادشاہ کو ''ظلِ الٰہی'' کی بجائے ''ظلِ شیطان'' کا خطاب دے ڈالا:

کیسا یہ شہ، کہ ظلم پر اس کی نگاہ ہے　　ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں دادخواہ ہے
لچا اِک آپ، ساتھ لٹیری سپاہ ہے ۷۰　　ناموسِ خلق سایہ میں اس کے تباہ ہے
شیطان کا یہ ظِل ہے، نہ ظِلِ الٰہ ہے ۷۱

مصحفی نے بھی کھل کے شاہ عالم کی بادشاہی کا مضحکہ اڑایا ہے:

کہتی ہے اسے خلقِ خدا سب شہِ عالم　　شاہی جو کچھ اس کی ہے سو عالم پہ عیاں ہے

اس فوج کشی کا خمیازہ شاہ عالم کو اس وقت بھگتنا پڑا جب روہیلہ سردار ضابطہ خاں کے لڑکے غلام قادر روہیلہ ۷۲ نے شاہی محل میں گھس کر اس کی آنکھوں میں دہکتی سلائیاں پھیر دیں (۱۰ اگست ۱۷۸۸ء) اور ''شہزادوں، شہزادیوں اور بیگمات کے ساتھ وہ ناروا سلوک کیا کہ اس کی وجہ سے تاریخ کی بدنام زمانہ ہستیوں میں ہمیشہ کے لیے اس کا نام درج ہو گیا۔''۷۳

خود شاہ عالم ثانی نے جو اُردو، فارسی اور پنجابی کا عمدہ شاعر بھی تھا اور آفتاب تخلص کرتا تھا، اس الم ناک سانحہ کو بڑے کرب سے یاد کیا ہے:

اے آفتاب! کر نہیں سکتا ہوں کچھ بیاں　　مجھ سے سلوک واہ، ان انکھیوں نے کیا کیا
دامان و آستیں کو، اے آفتاب، میرے　　خوں ناب میں ڈبایا، ان آنکھوں کا برا ہو
خوباں سے آشنا ہو، بیگانہ ہم سے ہو گئیں　　دیکھی ہیں سب جہاں میں نا آشنا، سو آنکھیں
کیا دن کو طعنہ کیجیے! اس کا گناہ کچھ نئیں　　اے آفتاب، کر گئیں مجھ سے دغا، سو آنکھیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری طرف انگریز بڑی حکمت عملی کے ساتھ ہندوستان میں اپنے استعماری عزائم کو آگے بڑھا رہے تھے، کرناٹک کی تیسری جنگ میں انھوں نے اپنے ہم مذہب استعماری حریف، فرانس کو فیصلہ کن شکست دی اور اسی صدی کے بالکل آخر میں ۴مئی ۱۷۹۹ء کو ٹیپو سلطان کو شکست دے کر انہوں نے اپنے راستے کا آخری پتھر بھی لڑھکا دیا۔ ستمبر ۱۸۰۳ء میں وہ فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوئے، جہاں نابینا بادشاہ بے بسی سے ان کے استقبال کے لیے موجود تھا، اور یوں تاریخ کا وہ دور شروع ہوا جس میں ہندوستان کی دولت وحشمت اگلی ڈیڑھ صدی تک تاجِ برطانیہ کی چمک دمک بڑھانے پر معمور ہوگئی۔ مصحفی نے اس عملِ انتقال کو اپنے اس لافانی شعر میں محفوظ کر دیا ہے:

ہندوستاں میں دولت وحشمت جو کچھ بھی تھی　　کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر لوٹ لی

یہی وہ خاص حالات تھے، جن کے پیشِ نظر دنیا کے مقابلے میں عقبیٰ کی طرف دیکھنے کا روّیہ بڑھنے لگا اور مادّی عدم آسودگی نے حساس طبائع کو رومانیت کی آغوش میں پناہ لینے کی تحریک دی۔ اٹھارویں صدی میں بحیثیت مجموعی تصوف لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کا وسیلہ بن گیا تھا، اس دور میں بے ثباتئ عالم، جبر و قدر، فنا و بقا، عشقِ حقیقی، قناعت اور جبر و تسلیم جیسے مضامینِ تصوف کو عام پذیرائی ملی اور صوفیا کی خانقاہوں، علماء کی مجلسوں اور شعرا کے مشاعروں میں انھی تصورات کو بہ اندازِ نو بیان کیا جانے لگا، یوں کیا شاہ اور کیا گدا، سب تصوف کے رنگ میں رنگے جانے لگے۔

حواشی اور تعلیقات

۱۔ Mathew Arnold, Essay: "The study of poetry" (1888), Printed in "Literary Criticism: A Reader", edited by B.Das and J.M.Mohanty, NewDelhi:OUP, 1985,P.67

۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''ارسطو سے ایلیٹ تک''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع: ہفتم، ۲۰۰۳ء، ص ۶۶۔

۳۔ دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ روحانی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کی درس گاہ بھی تصور کی جاتی تھی، شیخؒ خود بھی کمال درجے کا ذوقِ شعری رکھتے تھے اور امیر خسرو جیسی نابغۂ عصر شخصیت پہلے پہل مرشد کے ذوقِ معنوی سے ہی متاثر ہوئی تھی۔ امیر حسن سنجری، خواجہ ضیا الدین برنی اور امیر خورد جیسی علمی ہستیاں اسی درس گاہ کی فیض یافتہ تھیں۔ ممتاز حسین کے مطابق: ''شیخ نظام الدین کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جماعت خانہ ایک ادب گاہِ جمالیات بھی تھا۔ اس زمانے کے کسی بھی ایسے شاعر کے لیے جو کچھ مذاقِ تصوف بھی رکھتا ہو، اس کی تربیتِ شاعری کے لیے اُس کا اِس درس گاہ سے گزرنا ضروری تھا۔'' (ممتاز حسین، ''امیر خسرو دہلوی''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۲۰۵)

۴۔ احمد ایاز (راج کمار ہردیو) جو حضرت نظام الدین اولیاؒ کے چہیتے مرید تھے، شیخ کی سوانح عمری ''چہل روزہ'' میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ایک لسانی منصوبے کا ذکر کرتے ہیں جس میں آپؒ نے اپنے مریدین کو یہ نصیحت کی: ''تم سب مل کر ایک ایسی زبان تیار کرو جسے ہندوستان کے رہنے والے ہندو اور باہر کے آئے ہوئے مسلمان آپس کی بات چیت اور لین دین کے لیے کام میں لائیں......بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو فارسی، عربی اور ترکی زبانوں میں ہندی کی آمیزش نہیں چاہتے۔ اس لیے ان کو سمجھانا چاہیے کہ ان کا اور حکومت کا فائدہ اسی میں ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنے دل کی بات سمجھا سکیں اور خود ان کے دلوں کی حالت سمجھ سکیں۔ یہ جب ہی ہوگا کہ وہ ضد چھوڑ دیں اور ہندی بول چال کا چرچا بڑھائیں۔'' (''نظامی بنسری''، ترجمہ و تلخیص کتاب: ''چہل روزہ''، تلخیص و ترجمہ: ڈاکٹر محمود الرحمٰن، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۱۲۶۔۱۲۷)

۵۔ حافظ محمود شیرانی نے اگرچہ ''خالق باری'' کو موجودہ شکل میں امیر خسرو کی تصنیف ماننے سے انکار کیا ہے، تاہم ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''تاریخِ ادبِ اُردو'' میں دلائل کے ساتھ اسے امیر خسرو کی تصنیف ثابت کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ''تاریخِ ادبِ اُردو'' (جلد اوّل)، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، طبع: پنجم، مارچ ۲۰۰۵ء، ص ۲۸ تا ۳۴۔

۶۔ عزیز احمد، پروفیسر، ''برصغیر میں اسلامی کلچر''، مترجم: ڈاکٹر جمیل جالبی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، طبع: سوم، جون ۲۰۰۵ء، ص ۱۷۲۔

۷۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، ''دبستانِ نظام''، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، طبع: دوم، ۲۰۰۷ء، ص ۲۰۳۔

۸۔ اکرام، شیخ محمد، ''آبِ کوثر''، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، طبع: تیئس، جون ۲۰۰۶ء، ص ۱۸۴۔۱۸۵

۹۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، ''اُردو کی منظوم داستانیں''، انجمن ترقیِ اُردو، کراچی، طبع: دوم، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۸۔

۱۰۔ سوؔدا، مرزا رفیع، ''کلیاتِ سوؔدا'' (جلد اوّل)، مرتبہ: ڈاکٹر محمد شمس الدّین صدّیقی، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، مارچ ۱۹۸۷ء، ص ۴۰۶۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۱۔ درد، میر، ''دیوانِ درد'' (اُردو)، مرتبہ: خلیل الرحمٰن داؤدی مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، طبع: دوم، مئی ۱۹۸۸ء، ص ۱۲۳، ۱۴۸۔

۱۲۔ ''آہِ سرد'' کی ترکیب خواجہ میر درد کے ایک صوفیانہ رسالے سے ماخوذ ہے۔

۱۳۔ اس عہد کی بیش تر شاعری پر یاسیت اور ماتم گساری کے گہرے بادل نظر آتے ہیں اور ''نخلِ ماتم'' کی ترکیب سے اُجڑی دِلّی کی صحیح تصویر کشی ہوتی ہے:

اپنے نزدیک باغ میں تجھ بن　　جو شجر ہے سو نخلِ ماتم ہے

''دیوانِ درد''، ص ۲۰۹۔

۱۴۔ ابوالخیر کشفی، سیّد محمد، ''اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، نشریات، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۳

۱۵۔ اس معرکے کے حوالے سے جعفر زٹلی (م: ۱۱۲۵ھ/۱۳-۱۷۱۲ء) کے ''مرثیہ اورنگ زیب عالم گیر'' کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

ازیں سو اعظم و زیں سو معظم　　جھڑا جھڑ و دھڑا دھڑ ہر دو باہم

''زٹل نامہ'' (کلیاتِ جعفر زٹلی)، مرتب: رشید حسن خاں، انجمن ترقیِ اُردو، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۱۳۹۔

۱۶۔ تقدیر پرستی، شگون لینا اور علمِ غیب کے مخبروں کی پیش گوئیوں پر اعتقاد رکھنا اس دور کی عام روش تھی، کام بخش بھی اسی انفعالی ذہنیت کا مالک تھا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے لفظوں میں: ''اس کو خزانے اور فوج سے زیادہ نجومیوں اور رمّالوں کی پیش گوئیوں پر اعتقاد تھا کہ انجامِ کار وہ کامران ہوگا اور تخت حاصل کرے گا۔'' (''اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۵۷)

۱۷۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مغل اقتدار کے دورِ زوال کا آغاز بھی بہادر شاہ نامی بادشاہ سے ہوتا ہے اور اس کے اختتام پر بھی بہادر شاہ (ظفر) ہی حکمران تھا۔

۱۸۔ شمس الدّین صدّیقی، ڈاکٹر، بحوالہ مضمون: ''سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر''، مشمولہ ''تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' (ساتویں جلد)، مدیرِ خصوصی: سیّد وقار عظیم، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۷۱ء، ص ۳۔

۱۹۔ ثناء الحق، ''میر و سودا کا دور''، ادارہ تحقیق و تصنیف، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۲۱۔

۲۰۔ اکرام، شیخ محمد، ''رودِ کوثر''، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، جون ۲۰۰۵ء، ص ۶۱۷۔

۲۱۔ ثناء الحق، ''میر و سودا کا دور''، ص ۲۲؛

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جعفر زٹلی کے کلیات میں بہادر شاہ کے حوالے سے ایک ہجویہ رباعی ملتی ہے، جس میں اسے شاہِ زناں، دجال اور گدھوں کا خانِ خاناں کہا گیا ہے:

اے شاہِ زناں تاجِ شہاں برسرِ تو یاجوج و ماجوج بود لشکرِ تو
آثارِ قیامت زجبینت آشکار دجال توئی و خانِ خاناں خرِ تو

''زٹل نامہ'' (کلیاتِ جعفر زٹلی)، ص ۲۸۱۔

۲۲۔ غلام حسین خاں، سیّد، ''سیر المتاخرین'' [فارسی] (جلد اوّل)، کلکتہ، ۱۲۴۸ھ، ص ۱۲۔

۲۳۔ ابوالخیر کشفی، سیّد محمد، ''اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، ص ۲۷۔

۲۴۔ قائم چاند پوری، ''کلیاتِ قائم'' (جلد دوم)، مرتبہ: اقتدا حسن، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، دسمبر ۱۹۶۵ء، ص ۵۷۔

۲۵۔ ثناء الحق، ''میر و سودا کا دور''، ص ۲۲۔

۲۶۔ حمید یزدانی، ڈاکٹر خواجہ، ''خواجہ میر درد کی فارسی شاعری''، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، دسمبر ۱۹۹۳ء، ص ۱۴۔

۲۷۔ گیا اخلاص عالم سے، عجب یہ دور آیا ہے ڈرے سب خلق ظالم سے، عجب یہ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری، نہ بھائیوں میں وفاداری محبت اٹھ گئی ساری، عجب یہ دور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی، عمر سب جھوٹ میں کھوئی اتاری شرم کی لوئی، عجب یہ دور آیا ہے
خوشامد سب کریں زر کی، چہ بیگانہ چہ زن گھر کی بھلا دی بات سب ہر کی، عجب یہ دور آیا ہے

(''زٹل نامہ'' (کلیاتِ جعفر زٹلی)، ص ۲۹۶، معاشی بدحالی کے حوالے سے ''کلیاتِ جعفر زٹلی'' میں ایک آشوبیہ نظم ''در بیانِ نوکری'' کے عنوان سے ملتی ہے جس سے اس دور کی معاشی بدحالی کی اصل صورت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دیکھیے: ''زٹل نامہ'' (کلیاتِ جعفر زٹلی)، ص ۲۷۹۔۲۸۰)

۲۸۔ اکرام، شیخ محمد، ''رودِ کوثر''، ص ۵۹۸۔

۲۹۔ ابوظفر ندوی، سیّد، ''مختصر تاریخِ ہند''، مطبع معارف، اعظم گڑھ، طبع: دوم، ۱۹۳۸ء، ص ۱۸۳۔

۳۰۔ ابوالخیر کشفی، سیّد محمد، ''اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، ص ۳۰۔

۳۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخ ادبِ اُردو'' (جلد دوم)، ص ۱۲۵۔

۳۲۔ ثناء الحق، ''میر و سودا کا دور''، ص ۲۴۔

۳۳۔ ''زٹل نامہ'' (کلیاتِ جعفر زٹلی)، ص ۲۶۵۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۴ ابوالخیر کشفی، سیّد، محمد، ''اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، ص۲۹۔

۳۵ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخِ ادبِ اُردو'' (جلد دوم)، ص۳۔

۳۶ اکرام، شیخ محمد، ''رودِ کوثر''، ص۵۹۹۔

۳۷ ڈاکٹر محمد حسن کے مطابق: ''محمد شاہ کے دور میں دکن اور اودھ تقریباً خود مختار ہو گئے۔ جاٹ اور سکھ سیاسی طاقت کی حیثیت سے ابھرے، مرہٹوں کی رسائی آگرے کے دروازے تک ہونے لگی اور آخر کار دہلی بھی ان کی دست رسی سے نہ بچ سکی۔'' ''[دہلی میں اُردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر (عہدِ میرؔ تک)''، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص۱۱۶؛]

محمد شاہ رنگیلا کے دور میں مرکز کے متوازی جن خود مختار ریاستوں کی داغ بیل پڑی اور جن باغی گروہوں نے سر اُٹھایا وہ یہ ہیں:

(۱) دکن میں آصف جاہی سلطنت (۲) بنگال (۳) اودھ (۴) روہیلوں اور بنگش پٹھانوں کی حکومتیں (۵) سندھ میں کلہوڑوں کی حکومت (۶) مرہٹے (۷) جاٹ (۸) بندیلے راجپوت۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ''ثناء الحق (علیگ)، ''میر و سودا کا دور''، ص۲۷ تا ۳۰۔

۳۸ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخِ ادبِ اُردو'' (جلد دوم)، ص۳۔

۳۹ فرید آبادی ہاشمی، سیّد، ''تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و بھارت'' (جلد دوم)، انجمن ترقیِ اُردو، کراچی، ۱۹۵۳ء، ص۲۶۔۲۷۔

۴۰ ادھم بائی، مان خاں قوال کی بہن تھی، محمد شاہ کا جانشین، احمد شاہ اسی کے بطن سے پیدا ہوا۔ احمد شاہ نے بادشاہ بننے کے بعد ادھم بائی کو پہلے 'نواب بائی'' اور بعد میں نواب قدسیہ صاحب الزماں کا خطاب دیا۔ بحوالہ حاشیہ کتاب ''ذکرِ میرؔ''، ترتیب و ترجمہ: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، جون ۱۹۹۶ء، ص۲۳۷۔

۴۱ رحیم النساء کوکی، محمد شاہ کی رضائی بہن تھی، محلاتی جوڑ توڑ کی ماہر تھی، امورِ سلطنت میں اس کی رائے کا محمد شاہ ہمیشہ احترام کرتا تھا۔

۴۲ نواب درگاہ قلی خاں (۱۷۱۰ء۔۱۷۶۶ء) جو محمد شاہ رنگیلے کے دور میں دہلی آیا (۱۷۳۸ء) اور دربار میں رسوخ حاصل کیا، اس نے اپنے قیامِ دہلی کے مشاہدات ''مرقّعِ دہلی'' میں رقم کیے ہیں، اس تصنیف میں مرزا منّو کے ذوقِ امرد پرستی اور مجلس آرائی کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے: ''اس کا گھر بہشت شداد ہے اور اس کا کاشانہ پری زادوں کا مجمع۔ جو بھی رنگین نوخیز چھوکرا اُس کی اس محفل سے متعلق نہیں ہے وہ بے کارِ محض اور جو بھی نمکین لونڈا اس مجمع سے وابستہ نہیں ہے وہ ساکھ کے زیور سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محروم ہے...... جب تک حسن کے ریزہ کی نقدی (سکہ) اس کی بزم کی ٹکسال کی طرف رجوع نہیں کرتی، کامل عیار (صحیح طور پر کھری) قرار نہیں پاتی، بے شک وہ خالص سونے ہی کی مانند کیوں نہ ہو۔ اس طرح جمال کی چاندی جب تک اس مجمع...... کی کٹھالی میں سے گزر نہیں جاتی، چاندی نہیں کہلاتی بے شک وہ نقرۂ خالص کہلاتی پھرے۔'' (درگاہ قلی خاں، نواب، ''مرقعِ دہلی''، مترجم: ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی، ایلفا براوو، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۳۸۔)

۴۳۔ ثناء الحق، ''میر و سودا کا دور''، ص ۲۷۔۲۸۔

۴۴۔ جے ایس گریوال، ''سکھ''، ترجمہ: امجد محمود، بک ہوم، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۹۵۔

۴۵۔ نسیم، الف، د، ڈاکٹر: ''بارھویں صدی ہجری میں دِلّی کا شاعرانہ ماحول''، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۱۵۱۔۱۵۲۔

۴۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخِ ادبِ اُردو'' (جلد دوم)، ص ۴

۴۷۔ سودا، مرزا رفیع، ''کلیاتِ سودا'' (جلد چہارم)، مرتبہ: ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، مارچ ۱۹۸۷ء، ص ۷۷۔

۴۸۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''اُردو ادب کی تاریخ (۱۸۵۷ء تک)''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۵۹۔

۴۹۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، ''شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ''، ادبی اکادمی، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء، ص ۱۱۴۔

۵۰۔ شمس الدّین صدّیقی، ڈاکٹر، بحوالہ مضمون: ''سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر''، ص ۵۔

۵۱۔ خواجہ سرا جاوید خاں نے مزاجِ بادشاہ دیکھتے ہوئے حرم سرا کو حسین عورتوں سے بھر دیا تھا۔ احمد شاہ کی ماں ادھم بائی، اس پر بہت مہربان تھی، اس لیے احمد شاہ نے خواجہ سرا ہوتے ہوئے بھی اسے ہفت ہزاری منصب دیا۔ میر نے ''ذکرِ میر'' میں جاوید خاں کا ذکر ہمدردی سے کیا ہے اور اسے ''مظلوم خواجہ سرا'' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ دیکھیے: ''ذکرِ میر''، ص ۲۴۲۔

۵۲۔ ثناء الحق، ''میر و سودا کا دور''، ص ۳۵۔

۵۳۔ ایضاً

۵۴۔ میر، تقی میر، ''کلیاتِ میر'' [دیوانِ اوّل]، (جلد اوّل)، مرتبہ: کلب علی خاں فائق، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، طبع: دوم، جون ۱۹۸۶ء، ص ۳۲۲۔

۵۵۔ نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر، حاشیہ ''ذکرِ میر''، ص ۲۴۸۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵۶۔ ایضاً،ص۲۴۹۔

۵۷۔ ایضاً

۵۸۔ میرؔ، تقی میر، ''کلیاتِ میرؔ'' (جلد پنجم)، مرتبہ: کلب علی خاں فائق،مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، جون ۱۹۸۲ء، ص۱۰۹۔

۵۹۔ میرؔ، تقی میر، ''ذکرِ میرؔ''، ص۲۵۹۔

۶۰۔ حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراجِ خزاں آشنا اپنا بھی واں اِک سبزۂ بیگانہ تھا

''دیوانِ درد''، ص۱۱۶۔

۶۱۔ ایضاً، ص۲۳۴۔

۶۲۔ سوداؔ، مرزا رفیع، ''کلیاتِ سوداؔ''، ص۳۶۷۔

۶۳۔ ثناء الحق، ''میرؔ و سودا کا دور''، ص۳۶۔

۶۴۔ ذکاء اللہ دہلوی، ''تاریخِ ہندوستان'' (جلد نویں)، دہلی، ۱۹۰۷ء، ص۳۰۴۔

۶۵۔ میرؔ، تقی میر، ''ذکرِ میرؔ''، ص۲۷۰۔۲۷۱۔

۶۶۔ میرؔ، تقی میرؔ، ''کلیاتِ میرؔ'' [دیوانِ اوّل]، (جلد اوّل)، ص۳۴۹، ۱۴۴، ۵۵۶، ۱۸۲۔

۶۷۔ ''دیوانِ درد''، ص۱۴۱، ۱۳۹، ۱۱۷۔

۶۸۔ مرہٹوں کا اصل مرکز جنوبی ہند میں مہاراشٹر کا مقام تھا۔ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں سیوا جی (م: ۱۶۸۰ء) نے مرہٹوں کو سیاسی طور پر منظم کیا اور جنوبی ہند میں اپنی علیحدہ مملکت کے قیام کے لیے گوریلا کارروائیاں شروع کر دیں۔ اورنگ زیب کی بیش تر دکنی فوجی مہمات اسی مرہٹہ قوت کے خلاف رہیں۔ تاہم وہ تمام تر کوشش کے باوجود اس بغاوت کو مکمل طور پر ختم نہ کر سکا اور اس کی وفات کے فوراً بعد مرہٹوں کے دکنی مقبوضات تیزی سے بڑھنے لگے، یہاں تک کہ ۱۷۳۹ء تک وہ مالوہ اور بندیل کھنڈ جیسے اہم صوبوں کے فاتح بن چکے تھے اور محمد شاہ رنگیلا نے اِن مقبوضات پر مرہٹوں کا قانونی حق بھی تسلیم کر لیا تھا۔ یہیں سے مرہٹوں نے مغل حکومت کی کمزوری کا درست اندازہ لگا کر ہندوستان بھر پر مشتمل عظیم مرہٹہ حکومت بنانے کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ محض بیس سال بعد اپریل ۱۷۵۷ء تک وہ دہلی کو لوٹتے ہوئے لاہور پر قابض ہو گئے تھے۔ دریں اثنا نواب نجیب الدّولہ، حافظ رحمت خاں روہیلہ، نواب شجاع الدّولہ اور احمد شاہ ابدالی کے مشترکہ فوجی لشکر کے ہاتھوں مرہٹوں کو ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں تاریخی شکست ہوئی جس میں اہم مرہٹہ سردار مارے گئے اور اِن کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فوجی طاقت بری طرح کمزور ہوگئی، تاہم ہُلکر، مہادیو جی سندھیا، اور نانا فرنویس نے مرہٹہ طاقت کو ازسرِ نو منظم کیا اور ۱۷۷۲ء میں وہ شاہ عالم کو تخت دہلی پر بٹھا کر عملاً حکمران بن گئے اور یہ سلسلہ لارڈ لیک کی فتح دہلی (۱۸۰۳ء) تک جاری رہا۔

۶۹ منظور حسین، خواجہ، ''اُردو غزل کا خارجی روپ بہروپ''، مکتبۂ کارواں، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۶۷۔

۷۰ مرہٹہ فوج کی طرف اشارہ ہے۔

۷۱ قائمؔ چاندپوری، ''کلیاتِ قائمؔ'' (جلد دوم)، ص ۵۶۔

۷۲ غلام قادر، روہیلہ سردار نواب نجیب الدّولہ کا پوتا اور ضابطہ خاں کا بیٹا تھا۔ شاہ عالم ثانی نے ضابطہ خاں کے خاص مرکز غوث گڑھ کو فتح کیا تو غلام قادر بھی قیدیوں کے ساتھ گرفتار ہو کر دہلی لایا گیا۔ شاہ عالم ثانی، جو حسن پرست واقع ہوا تھا، اس نے اس کم سن مگر حسین لڑکے کو نامرد کرا کے اپنا ''فرزندِ خاص'' بنا لیا، غلام قادر اپنے خاندان اور خود پر ہونے والے مظالم کے انتقام کے لیے موقع کی تلاش میں تھا اور یہ موقع اُسے اگست ۱۷۸۸ء میں مل گیا، اس حوالے سے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کا تبصرہ بڑا برمحل ہے کہ:

''جب غلام قادر نے شاہ عالم کو اندھا کرایا تو دراصل تاریخ نے اپنے آپ کو نئے انداز میں دہرایا۔ کبھی اس کے باپ کی بیویوں اور کنیزوں کو مجمع عام میں نچوایا گیا تھا اور اس نے مغل شہزادیوں سے اِس بے عزتی کا بدلہ لے لیا۔'' (''اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، ص ۱۵۶۔)

غلام قادر روہیلہ، ۱۹ دسمبر ۱۷۸۸ء کو مرہٹہ سردار سندھیا کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور بے رحمی سے مارا گیا۔

۷۳ ثناء الحق، ''میر و سودا کا دور''، ص ۴۷۔

۷۴ خاور جمیل، ڈاکٹر، ''شاہ عالم ثانی آفتاب: احوال و ادبی خدمات''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۸۹، ۲۰۶، ۲۰۰۔

۷۵ مصحفی، غلام ہمدانی، ''کلیاتِ مصحفی'' (دیوانِ سوم)، مرتبہ: ڈاکٹر نورالحسن نقوی، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، اپریل ۱۹۷۱ء، ص ۳۱۱۔

فہرستِ اسنادِ محولہ:

۱۔ احمد ایاز (راج کمار پردیو)، ''چہل روزہ''، ترجمہ و تلخیص: ''نظامی بنسری''، ڈاکٹر محمود الرحمٰن، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء۔

۲۔ احمد، عزیز، پروفیسر: ''برصغیر میں اسلامی کلچر''، طبع سوم، مترجم: ڈاکٹر جمیل جالبی، لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۵ء۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۔ احمد، نعیم، ڈاکٹر: ''شہرِ آشوب کا تحقیقی مطالعہ''علی گڑھ، ادبی اکادمی، ۱۹۷۹ء۔

۴۔ اکرام، محمد، شیخ: ''آبِ کوثر''، لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۶ء۔

۵۔ اکرام، محمد، شیخ: ''رودِ کوثر''، لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۶ء۔

۶۔ ثناء الحق: ''میر وسودا کا دور''، کراچی، ادارۂ تحقیق وتصنیف، ۱۹۶۵ء۔

۷۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر: ''تاریخِ ادب اُردو''، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، جلد اوّل، دوم، ۲۰۰۵ء۔

۸۔ چاند پوری، قائم: ''کلیاتِ قائم'' (جلد دوم)، مرتبہ: اقتدا حسن، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۶۵ء۔

۹۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر: ''ارسطو سے ایلیٹ تک''، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۳ء۔

۱۰۔ حسین، منظور، خواجہ: ''اُردو غزل کا خارجی ادب''، لاہور، مکتبۂ کارواں، ۱۹۸۱ء۔

۱۱۔ خاں، غلام حسین، سیّد: ''سیر المتاخرین'' [فارسی] جلد اوّل، کلکتہ، ۱۲۴۸ھ۔

۱۲۔ خان، قلی، ورگاہ، نواب: ''مرقع دہلی''، مترجم ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی، لاہور، ایلفا براوو، ۱۹۸۸ء

۱۳۔ خاور جمیل، ڈاکٹر: ''شاہ عالم ثانی آفتاب: احوال وادبی خدمات''، دہلی، ایجوکیشنل، پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۹ء۔

۱۴۔ درد، میر: ''دیوانِ درد'' (اردو)، طبع دوم، مرتبہ: ''خلیل الرحمٰن داؤدی، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۸۸ء۔

۱۵۔ دہلوی، ذکاء اللہ: ''تاریخ ہندوستان'' (جلد نویں)، دہلی، ۱۹۰۶ء۔

۱۶۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر: ''اُردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء۔

۱۷۔ زٹلی، جعفر: ''زٹل نامہ'' (کلیات جعفر زٹلی)، مرتبہ: رشید حسن خان، دہلی، انجمن ترقی اُردو، ۲۰۰۳ء۔

۱۸۔ سودا، مرزا رفیع: ''کلیاتِ سودا''، (جلد اوّل، چہارم)، مرتبہ: ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء۔

۱۹۔ عظیم، وقار، سیّد: مدیرِ خصوصی ''تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند''، (جلد ہفتم)، طبع اوّل، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء۔

۲۰۔ فرخی، اسلم، ڈاکٹر: ''دبستانِ نظام''، طبع دوم، لاہور، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۰۷ء۔

۲۱۔ فرید آبادی، ہاشمی، سیّد: ''تاریخ مسلمانانِ پاکستان وبھارت'' (جلد دوم)، کراچی، انجمن ترقی اُردو، ۱۹۵۳ء۔

۲۲۔ کاشمیری، تبسم، ڈاکٹر: ''اُردو ادب کی تاریخ (۱۸۵۷ء تک)''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔

۲۳۔ کیفی، ابوالخیر، محمد، سیّد: ''اُردو کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، لاہور، نشریات، ۲۰۰۷ء۔

۲۴۔ گریوال، جے ایس: ''سکھ''، ترجمہ، لاہور، امجد محمود بک ہوم، ۲۰۰۳ء۔

۲۵۔ محمد حسن، ڈاکٹر: ''دہلی میں اُردو شاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر (عہد میر تک)''، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۸۹ء۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۶۔ مصحفی، غلام ہمدانی: ''کلیاتِ مصحفی''، (دیوانِ سوم)، مرتبہ: ڈاکٹر منظور الحسن نقوی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء۔

۲۷۔ ممتاز حسین: ''امیر خسرو دہلوی''، کراچی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۶ء۔

۲۸۔ میر، تقی میر: ''ذکرِ میر''، ترتیب و ترجمہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۶ء۔

۲۹۔ میر، تقی، میر: ''کلیاتِ میر'' [دیوانِ اوّل] (جلد اوّل)، طبع دوم، مرتب کلب علی خاں فائق، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶ء۔

۳۰۔ میر، تقی، میر: ''کلیاتِ میر'' [دیوانِ اوّل] (جلد پنجم)، طبع دوم، مرتب کلب علی خاں فائق، لاہور، مجلس ترقی ادب، سنہ ندارد۔

۳۱۔ ندوی، ابوظفر، سیّد: ''مختصر تاریخ ہند''، طبع دوم، اعظم گڑھ، مطبع معارف، ۱۹۳۸ء۔

۳۲۔ نسیم، الف، د، ڈاکٹر: ''بارہویں صدی ہجری میں دلّی کا شاعرانہ ماحول''، لاہور، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۹۹ء۔

۳۳۔ یزدانی، حمید، خواجہ، ڈاکٹر: ''خواجہ میر درد کی فارسی شاعری''، لاہور، مغربی پاکستان، اردو اکیڈمی، ۱۹۹۳ء۔

© rasailojaraid.com